خلافتِ ارض اور علماء کی ذمہ داریاں

عصرِ جدید کا ایک اہم تجدیدی کام اور اس کی نوعیت

جناب مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈیمی بنگلور

(قسط دوم)

سائنس اور فلسفۂ جدید کا نیا آہنگ

تصوریت یا وحدۃ الشہود:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا فلسفۂ جدیدہ کی بنیاد جدید سائنس کے مسلّمہ حقائق و نظریات پر ہے اور سائنسی نظریات میں ترمیم و اضافے کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ کے مسائل و مباحث بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جدید سائنس نے چونکہ مادیت (Materialism) اور میکانیت (Mechanism) کے بے بنیاد نظریات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے[1] اس لیے اب

---

[1] تمام فلسفیانہ نظریات اصولی اعتبار سے چار مذاہب (اسکول آف تھاٹ) میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ جو یہ ہیں۔ (۱) ثنویت یا دوئی (۲) تصوریت یا روحیت (۳) مادیت۔ اور (۴) اریتابیت۔ ان میں سے اول الذکر دو براہ راست یا بالواسطہ مذہب کے مؤید و حامی ہیں، تیسرا معاند ہے اور چوتھا نہ دوست ہے اور نہ دشمن۔

تفصیل کے لیے دیکھیے "مذہب و عقلیات" از مولانا عبد الباری ندوی)

جدید سائنس اور فلسفۂ جدید کا آہنگ "تصوریت"[1] یا ایک "ہمہ گیر کائناتی ذہن" قرار پاتا ہے۔ اس طرح آج یہ دونوں روحانیت کے اثبات میں مذہب کے مؤید اور اس کے حامی نظر آتے ہیں۔

---

[1] نظریۂ تصوریت کو سمجھنے کے لیے نظریہ ثنویت کو سمجھنا ضروری ہے اور ثنویت (Dualism) نام ہے اس چیز کا کہ کائنات میں دو بالکل مختلف اور متضاد چیزیں پائی جاتی ہیں یعنی جسم اور روح یا مادہ اور عقل و شعور۔ تمام مذاہب کی تعلیمات کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ اور ارسطو کا بھی یہی نظریہ تھا۔ اس کے برعکس تصوریت (Idealism) کا نظریہ یہ ہے کہ اصل الاصول صرف ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے روح یا عقل یا ذہن، باقی تمام عالم جسمانیات اسی کا پرتو ہیں اور مادیت کا مستقل وجود ایک وہم کا فریب ہے۔ دور قدیم میں فلاطون اسی کا داعی تھا جب کہ دور جدید میں اسپنوزا (Spinoza) لائبنیز (Leibnitz) برکلے (Berkeley)، شیلنگ (Schelling) ہیگل (Hegel) اور برگسان (Bergsan) وغیرہ سب اس کے ہمنوا اور مؤید ہیں۔ مذہب میں صوفیہ اور ارباب باطن سے ان قائلین تصوریت کے ڈانڈے اس قدر مل جاتے ہیں کہ صرف حال اور قال کا پردہ رہ جاتا ہے۔ (ماخوذ از مذہب و عقلیات، ص ۱۱)

واضح رہے کہ قرآنی عقائد و تعلیمات کے مطابق "وحدۃ الوجود" کے بے بنیاد نظریہ کی صحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں البتہ "وحدت الشہود" کا اثبات اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں صفات الٰہی سے متعلق جتنے بھی دعوے کیے گئے ہیں ان کا ثبوت مشاہداتی طور پر اس عالم رنگ و بو میں موجود ہے جو سائنسی علوم کے تفصیلی مطالعے سے حاصل ہوتا ہے، جبکہ وہ قرآن حکیم کی ہدایات کے مطابق کیا جائے اور ان دونوں میں تطبیق دی جائے۔ لہٰذا اس موقع پر مجھے اسی نقطۂ نظر کا اثبات مقصود ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب نیوٹن نے قانون تجاذب کو دریافت کیا تو مادہ پرستوں کو نظام کائنات کی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے توجیہہ کرنے کے لیے بظاہر ایک قوی بنیاد مل گئی اور وہ یہ سمجھے کہ اس قانون کی دریافت کے باعث عالم طبیعی اور عالم حیاتیاتی کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، چنانچہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تحریر فرماتے ہیں:

"جب نیوٹن نے سترھویں صدی میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی۔ فرانس کے مشہور ریاضی داں لاپلاس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکانکس ایک ہی ہو سکتی ہے اور اس میکانکس کو نیوٹن نے دریافت کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ اب اس کے بعد طبیعی سائنس میں کسی کے لیے کچھ کرنا باقی نہیں رہا۔ ۱۹ ویں صدی میں اس میکانکس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ نہ صرف طبیعی سائنس بلکہ حیاتیاتی علوم میں بھی اس کا اطلاق کیا جانے لگا اور انسانی اعضاء بلکہ دماغ کے افعال کی توجیہہ بھی میکانکی اصول پر ہونے لگی اور یہ سمجھا جانے لگا کہ جس سائنس کی بنیاد اس میکانکی اصول پر نہ ہو وہ باضابطہ سائنس ہی نہیں ہو سکتی۔"[1]

ایک طرف تو یہ کوشش ہو رہی تھی اور دوسری طرف چند دیگر سائنس دانوں ہی کے تجربات و تحقیقات کی بدولت ایسے نتائج برآمد ہوئے کہ مذکورہ بالا مادہ پرستانہ نظریات کا قلع قمع ہو گیا اور یہ ذہنیت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، چنانچہ ڈاکٹر موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبیعیات

---

[1] مقدمہ مذہب اور سائنس، ص ۳۶، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۷۱ء

انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اسی زمانے میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں اور علم طبیعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ و توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت و معلول جیسے بنیادی تصور ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانین قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبیعیات کی بجائے اس جدید طبیعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔[1]

انیسویں صدی کی طبیعیات میں مادہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصور کیے جاتے تھے۔ جدید طبیعیات میں مادہ اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہوگیا اور تجربوں سے ثابت ہوگیا کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں یعنی مادے کو توانائی میں اور توانائی کو مادے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۹۰۰ء میں پلانک (Planck) نے کوانٹم (Quantum) کا انکشاف کیا اور بتایا کہ توانائی اور مادی نظام کی حالتوں میں تبدیلی مسلسل نہیں بلکہ ایک خاص قلیل ترین مقدار یعنی کوانٹم کے اضعاف (Multiples) کے مناسب ہوتی ہے۔ اس انکشاف کے بعد قدیم ترین زمانے سے طبیعی کائنات میں تغیر و تبدل کے مسلسل اور تدریجی ہونے کا تصور چلا آرہا تھا، وہ ختم ہوگیا اور اس کی وجہ سے نیوٹن کی میکانکس میں ایک غیر معمولی انقلاب رونما ہوا۔[2]

آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت (Relativity) نے زمان و مکان کے تمام قدیم تصورات کو بدل کر رکھ دیا اور علت و معلول سے متعلق جبریت

---

[1] مقدمہ مذہب اور سائنس، ص ۳۶-۳۷۔ [2] ایضاً ص ۳۷-۳۸۔

کا نظریہ بھی باطل ہو گیا، چنانچہ خود سائنس دانوں کو ہتھیار ڈالتے ہوئے سائنس کے حدود نئے سرے سے متعین کرنے پڑے۔

"سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی اصلی اور آخری ماہیت اور حقیقت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیاء اور مظاہر میں باہمی ربط و تعلق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر کہا کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیت کیا ہے بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوت برق کا عمل کیا ہے"۔ [1]

طبیعی علوم کی انہی ترقیوں کی بدولت مادیت و دہریت اور جبر و تعین کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور تمام جدید فلاسفہ مثلاً: ہائی زن برگ، سر جیمز جینز، سر آرتھر ایڈنگٹن اور وہائٹ ہیڈ وغیرہ کا اس بنیادی نقطہ نظر پر تقریباً اتفاق ہو چکا ہے کہ ہماری اس کائنات میں مادیت کے بجائے بنیادی طور پر "تصوریت" یا "ذہنیت" پائی جاتی ہے اور ایک "ہمہ گیر آفاقی ذہن" (Universal mind) کا اثبات ہوتا ہے۔ [2]

فلسفہ تصوریت کی وہ صدا جو مشہور فلسفی برکلے (۱۶۸۵-۱۷۵۳ء) نے روحانیت کے اثبات میں اب سے کوئی ڈھائی سو سال پہلے بلند کی تھی آج جدید سائنس اس کی تائید کر رہی ہے اور تمام جدید فلاسفہ اس کو چار و ناچار ماننے پر مجبور نظر آ رہے ہیں۔

وحدتِ کائنات یا کائنات کے ایک یونٹ ہونے کا یہی وہ آفاقی تصور ہے جو توحید باری تعالیٰ اور ایک واجب الوجود ہستی کے اثبات کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اسی کا نام تصوف کی اصطلاح میں "وحدت الشہود" ہے جو کم از کم سائنٹفک نقطہ نظر سے ایک

---

[1] مقدمہ مذہب و سائنس ص ۴۴ [2] تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب "مذہب اور سائنس"

وجدانی اور مشاہداتی چیز ہے۔ یعنی جو شخص مذہبی نقطۂ نظر سے ایک ذات والا صفات اور فوق الطبیعی ہستی کے وجود کا قائل ہو اس کے لیے مظاہر کائنات اور ان کے تفصیلی و گہرے علم و مطالعے سے اس ذات برتر کے وجود اور اس کی صفات عالیہ و صفات کمالیہ کا نظارہ بالکل عین الیقین اور حق الیقین کے درجہ میں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وحدت الشہود یا توحید شہودی کو کما حقہٗ سائنٹفک نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لیے جدید سائنس کا مطالعہ ضروری ہے اور یہ حاصل ہے قرآن اور سائنس کے مطالعے کا جو کہ مقصد المقاصد ہے۔

کائنات میں صفاتِ الٰہی کے جلوے :

اصل میں مظاہر فطرت کے گہرے مطالعے و تجزیے سے مادہ اور روح کے درمیان فاصلے کم سے کم اور ان کے درمیان حائل شدہ پردے ہٹتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ تصور میں ایک ہی چیز دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور وہ ہے ایک عظیم اور پر جلال ہستی کی کارفرمائی اور اس کی ربوبیت والوہیت کے آفاقی جلوے جو ایک ننھے سے ایٹم سے لے کر ایک بڑے سے بڑے جرم فلکی تک ہر چیز میں جاری و ساری نظر آتے ہیں۔ اب آپ اس کا نام "وحدت الشہود" رکھ لیجیے یا مظاہر کائنات میں ربوبیت والوہیت کا آفاقی اور ہمہ گیر مشاہدہ، دونوں کا ماحصل ایک ہی رہے گا۔ قرآن حکیم نے جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و الوہیت اور اس کی دیگر جن صفات کے اثبات کی خاطر مظاہر فطرت اور ان کے نظاموں کا مطالعہ کرنے کی جو دعوت دی ہے اس کا اصل مقصد یہی ہے۔ وہ پورے جزم اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی رب اور ایک ہی الٰہ ہے اور ہر طرف اسی کی کارفرمائیاں اور جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً :

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وہی ہے جو تمہاری رحم (مادر) میں صورت گری جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ (بنانے اور حیرتناک افعال والا) موجود نہیں ہے۔ وہی (ہر چیز پر)

غالب اور حکمت والا ہے۔ (آل عمران: ۶)

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ج وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ج وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ یہی ہے اللہ تمہارا رب جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ موجود نہیں ہے۔ ہر چیز کا وہی پیدا کرنے والا ہے پس تم اسی کی عبادت کرو اور ہر چیز اسی کے حوالے ہے۔ (انعام: ۱۰۱-۱۰۲)

اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں جہاں پر کائنات کے مختلف مظاہر اور ان کے نظاموں کا تذکرہ کرنے کے بعد خصوصیت کے ساتھ ربوبیت والوہیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور سورۂ انعام کی جو آیتیں اوپر نقل کی گئی ہیں ان سے قبل عالم سماوی اور عالم ارضی سے تعلق رکھنے والی مختلف چیزوں مثلاً چاند، سورج، ستارے، رات، دن، بر و بحر، اور خصوصیت کے ساتھ نباتات اور ان کے چند خصوصی مظاہر کا ایک جامع تذکرہ آگیا ہے۔ پھر اس کے بعد اوپر کی آیات مذکور ہیں۔ اس سیاق و سباق میں ربوبیت والوہیت کے تذکرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام نظاموں کے بیان کرنے سے اصل مقصود نوع انسانی کے ذہن و دماغ میں ربوبیت والوہیت کی حقیقت کو اتار دینا ہے۔

چنانچہ لغوی اعتبار سے "الٰہ" کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ یہ اَلِہَ یَالَہُ (مرباب سمع) سے مشتق ہے یعنی وہ ہستی جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو جائے۔[1] امام راغب تحریر فرماتے ہیں:

"اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ لفظ اَلِہَ سے مشتق ہے۔ یعنی حیران ہونے کے معنی میں۔ اور یہ وجہ اشتقاق امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) کے اس قول کی بنا پر ہے کہ "اس ذات برتر کی

---

[1] ملاحظہ ہو سیرت النبی، از علامہ سید سلیمان ندوی، ۴/۵۰۵، اعظم گڈھ۔

صفات کے بیان سے تمام بہترین صفات اور تمام زبانوں کے الفاظ بھی عاجز اور ناکافی ہیں"۔ اور یہ اسی بنا پر ہے کہ بندہ جب باری تعالیٰ کی صفات میں غور کرتا ہے تو وہ حیران و سرگرداں ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مروی ہے "تَفَکَّرُوْا اٰلَاءَ اللّٰہِ وَلَا تَفَکَّرُوْا فِی اللّٰہِ"۔ یعنی اللہ کی کرشمہ سازیوں (اس کی صفات کمالیہ) میں غور کرو اور اللہ کی ذات میں غور مت کرو۔[1]

اس لحاظ سے "لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ" کے معنی یہ ہوئے کہ اس پوری کائنات اور کل عالم رنگ و بو میں ایک ہی ایسی ہستی پائی جاتی ہے جس کے افعال حد درجہ نرالے اور حیرتناک ہیں اور جن کی اصل حقیقت و ماہیت کے سمجھنے سے عہد قدیم ہی کے نہیں بلکہ عہد جدید کے تمام انسان ـــــ اپنی ہمہ جہتی تمام علمی ترقیوں کے باوجود ـــــ عاجز و درماندہ ہیں، جیسا کہ تفصیلات پہلے باب میں گذر چکیں آپ مظاہر عالم کا طبیعی (Physical) کیمیاوی (Chemical)، عضویاتی (Morphological) فعلیاتی (Physiological) تشریحی (Anatomical)، طبی (Medical) اور نفسیاتی (Psychological) کسی بھی حیثیت سے جائزہ لیجیے آپ کو یہ ایک اٹوٹ کلیہ نظر آئے گا۔ گویا کہ ہر حیثیت سے یہ اس عالم آب و گل کی ایک مسلمہ اور ناقابل تردید حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہیں۔

اس طرح تمام صفات الٰہیہ کا جب اس قدر تفصیلی طور پر مطالعہ کیا جائے تو مجموعی اعتبار سے ان صفات کمالیہ کا ایک واضح تصور مجسم شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے گا، پھر ہماری نظریں جس چیز پر بھی پڑیں گی اس کی ظاہریت کے خول کو توڑتے ہوئے ان صفات عالیہ پر مرکوز ہو جائیں گی، گویا کہ ہم ان ظاہری مظاہر کو نہیں بلکہ

---

[1] المفردات فی غریب القرآن، ص ۲۱، طبع بیروت۔

ان مظاہر میں پیوستہ کمالات الٰہی کے جمال نیرانی کو دیکھ رہے ہیں اور اس کے آفاقی جلووں کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اس مطالعے و مشاہدے سے جو ایمان حاصل ہوتا ہے وہ محض علمی اور نظریاتی نہیں رہتا بلکہ وہ مشاہداتی ہونے کی بنیاد پر وجدانی اور جذباتی بن جاتا ہے۔ گویا کہ بندہ عین الیقین اور حق الیقین کی منزل تک پہنچ چکتا ہے۔ یہ بندے کی منزل مقصود اور اس کی معراج ہے۔ جس کے حصول کے بعد اس کو کارزار حیات میں بھٹکنے یا مظاہر فطرت کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کا موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ بلکہ وہ زندگی کی ہر منزل اور تمام نشیب و فراز میں برہان الٰہی کی روشنی میں چلتا ہے اور "نور الٰہی" اس پر سایہ فگن رہتا ہے، بشرطیکہ یہ مطالعہ و مشاہدہ صحیح اور خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے اور قرآن حکیم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیا جائے۔ ورنہ دنیا میں کتنے ایسے سائنس داں اور ماہرین علوم طبیعی موجود ہیں جو ان علوم میں ماہر ہونے کے باوجود بالکل کورے اور اندھے بہرے بنے ہوئے ہیں۔

وحدت الوجود یا وحدت الشہود

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی چند صفات عالیہ کا بیان اس طرح کیا گیا ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج وہی سب سے پہلے، سب سے آخر، سب سے ظاہر، اور سب سے چھپا ہوا ہے۔ (حدید: ۳)

اس کی تشریح میں علامہ ابن قیم رح فرماتے ہیں: "دنیا کی ہر چیز کا ایک اول، ایک آخر، ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایک لحظے اور ایک نفس کا بھی مگر اللہ تعالیٰ کی اولیت اس کی قدامت ہے، اس کی آخریت اس کا دوام اور بقا ہے، اس کا ظاہر ہونا اس کی عظمت و برتری ہے اور اس کا پوشیدہ ہونا اس کا قرب اور ہر چیز کا احاطہ ہے۔"[1]

[1] طریق الہجرتین و باب السعادتین، ص ۳۸۔۳۹، مطبوعہ قطر،

ظاہر اور باطن کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حیرت انگیز صفات و کمالات کے باعث ہر چیز میں ظاہری و باطنی اعتبار سے نمایاں نظر آتا ہے یعنی کسی بھی چیز کے ظاہر و باطن میں اسی کے کمالات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، خواہ ایک بڑے سے بڑا نظام شمسی ہو یا ایک ننھا سا جوہر یا ایٹم حتیٰ کہ ظاہری آنکھوں کو نظر نہ آنے والے ایٹم کا اگر سینہ بھی چیرا جائے تو اس میں بھی اسی کے خالق کے کمالات کی ایک پوری دنیا نظر آتی ہے جس کا کلی احاطہ کرنے سے انسانی علم و دانش عاجز و بے بس دکھائی دیتے ہیں۔

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ وہ ایک حیثیت سے بالکل ظاہر ہے گویا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور دوسری حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ صدرجہ پوشیدہ اور مخفی ہے۔ گویا کہ کسی آنکھ کو نظر ہی نہیں آتا۔

بہرحال آپ صحیفۂ فطرت میں جدھر بھی نظر ڈالیے آپ کو اس کے خالق و صانع ہی کی صفات کمالیہ کے نقوش دکھائی دیں گے اور اس کی ربوبیت و الوہیت تمام مظاہر پر محیط نظر آئے گی۔ گویا کہ اوراقِ فطرت کی حیثیت محض کٹھ پتلیوں جیسی ہے اور ان کے پس پردہ شاہد حقیقی جلوہ افروز ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ خالق کا ظہور نمایاں اور مخلوقات کا ظہور غیر نمایاں اور دھندلا سا ہے۔ گویا کہ یہ سب کسی ڈرامے کے عارضی اور غیر مستقل کرداروں کی طرح پردۂ سیمیں پر تھوڑی دیر کے لیے نظر آتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔

مگر اس بحث سے مادہ یا جسمانیات کا انکار لازم نہیں آتا، جیسا کہ فلسفۂ تصوریت کے قائلین نیز اہل باطن وغیرہ نے اپنی انتہا پسندی میں اختیار کیا ہے۔ اسی طرح اس موقعہ پر وحدت الوجود کے قائلین کی بھی کسی بھی درجے میں تائید نہیں نکلتی۔ کیونکہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ خالی "وجود یوں" کا دعویٰ ہے اور عقیدہ ہے کہ اس پورے عالم رنگ و بو میں صرف ایک ہی وجود ہے۔ مجرد شجر، آب و خاک،

مرغ و ماہی اور جن و بشر وغیرہ تمام مظاہر اسی وجود واحد کے مختلف روپ ہیں۔ اور مومن و مشرک، نیک و بد، عادل و جابر اور اچھے اور برے سب اس میں برابر ہیں اور اپنے ان مہمل عقائد کی تائید میں قرآن اور حدیث سے (عجیب اور اوچھے انداز میں) تاویل کرتے ہیں۔[۱]

نیز ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہر وقت کھلے بندوں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اس سے انبیاء رہی کی طرح فیض رسانی پاتے ہیں اور ان میں سے بعض تو مرتبے میں اپنے آپ کو انبیاء سے بھی افضل سمجھتے ہیں اسی طرح ان میں سے بعضوں کا ادعا ہے کہ وہ ولایت و معرفت کے مقامات طے کر لینے کے بعد شرعی قیود اور پابندیوں سے بھی آزاد ہو چکے ہیں۔[۲]

رویت باری کے سلسلے میں کتاب الٰہی میں صاف مذکور ہے کہ (اس عالم ناسوت میں) کسی بھی طرح باری تعالیٰ کا مشاہدہ حاسۂ بصر کے ذریعہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر تمام علمائے اہل سنت کا اتفاق ہے۔[۳]

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ج وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۝۔ نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ وہ بڑا ہی باریک بین اور باخبر ہے۔ (انعام: ۱۰۴)

مگر "وجودی" حضرات کہتے ہیں چونکہ وجود واحد ہے، جس کے مظاہر مختلف ہیں اس لیے یہاں بھی رویت ثابت ہوتی ہے اور رائی و مرئی (دیکھنے والا اور دیکھا جانے والا) دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی رب عین بندہ ہے اور بندہ عین رب۔ اللہ خود اپنے آپ کو اپنے بندوں

---

[۱] تفسیر المنار، ۹/۱۳۲، دار المعرفہ، بیروت۔
[۲] ایضاً ۹/۱۳۱—۱۳۲۔
[۳] ایضاً ۹/۱۴۹۔

اور دیگر مخلوقات کی شکل میں دکھاتا ہے۔ یہ اُن لوگوں کا تناقض و ہذیان ہے جو بدیہی طور پر باطل ہے[۱]

اس سلسلے میں علامہ رشید رضا نے "فتوحات مکیہ" سے ابن عربی کی ایک طویل عبارت بھی نقل کی ہے جس میں بڑا تعارض و تضاد پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موصوف ایک ہی سانس میں تائید بھی کر رہے ہیں اور تردید بھی۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ملاحظہ فرمائیے:

وان نحن لم نزل فیما نری الا انفسنا فیه و صورنا وقدرنا ومنزلتنا فعلی کل حال ما رأیناه وقد نتوسع فنقول قد رأیناه وتصدق کما انه لو قلنا رأینا الانسان صدقنا فی ان نقول رأینا من مضی من الناس ومن بقی ومن فی زماننا من کونهم انساناً لا من حیث شخصیة کل انسان، ولما کان العلم اجمعه واحاده علی صورة حق ورأینا الحق فقد رأینا وصدقنا:

ہم ہمیشہ اپنے آپ کو، اپنی صورتوں کو اور اپنی قدر و منزلت کو اس میں برابر دیکھتے رہتے ہیں۔ پس (اس طرح) ہم کسی بھی حال میں اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ اور تھوڑی سی وسعت کے ساتھ ہم کہیں گے کہ ہم اس کو دیکھ چکے ہیں اور ہم سچ کہتے ہیں۔ جس طرح کہ اگر ہم یوں کہیں کہ ہم نے انسان کو دیکھا تو ہم نے اس بارے میں سچ کہا کہ ہم نے دیکھا اس شخص کو جو گذر گیا اور اس کو بھی جو باقی ہے اور جو ہمارے زمانے میں ہے، اپنے انسان ہونے کی حیثیت سے نہ کہ ہر انسان کی شخصیت ہونے کے لحاظ سے اور چونکہ تمام عالم اور اس کے پرزے حق (تعالیٰ) کی صورت میں ہیں اور ہم نے حق کو دیکھ لیا ہے تو ہم نے ضرور دیکھ لیا ہے اور ہم سچ کہتے ہیں[۲]

---

[۱] تفسیر المنار، ۹/ ۱۶۷

[۲] فتوحات مکیہ، باب ۱۰۴، بحوالہ تفسیر المنار ۹/ ۱۶۸

یہ عجیب وغریب اور مغالطہ انگیز کلام نظر آتا ہے۔ اصل میں یہ "ہمہ اوست" کے فلسفیانہ عقیدے کی ترجمانی ہے، چنانچہ اس سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے "لا الہ الا اللہ" کو لا موجود "الا اللہ" قرار دے دیا گیا[۱] جو کتاب وسنت اور عربی لغت وادب سب کے خلاف اور من مانی تاویل ہے۔ شیعہ حضرات بھی قرآنی نصوص کی اسی طرح اوچھی اور بے سروپا تاویل کرتے ہیں۔ آخر ہم انھیں کس بنیاد پر گمراہ قرار دیں؟ اصول تو سب کے لیے ایک ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا عقیدہ فلسفے کی راہ سے آیا ہے۔ اور محققین کی نظر میں یہ ایک کشفی[۲] و اشراقی[۳] چیز ہے، جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہونے کے بجائے محض ذاتی مشاہدات اور کشف وغیرہ پر مبنی ہے جو شرعاً قابل حجت نہیں ہو سکتا بلکہ صراحتاً کتاب وسنت کے مغائر ہے، چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب "وحدت الوجود" از بحر العلوم عبدالعلی انصاری، ص ۵۶، دہلی، ۱۹۷۱ء

[۲] "لغۃً کشف کے معنی کھولنے یا کسی حقیقت کو واضح کرنے کے ہیں۔ فلسفہ وتصوف کی اصطلاح میں اس سے مراد سکر وسرمستی کے ایسے لمحے ہیں جب کسی شخص کی محدود "انا" پھیل کر غیر محدود "انا" سے اپنا رشتہ استوار کر لیتی ہے اور عجیب وغریب حقائق وکیفیات سے دوچار ہوتی ہے") (عقلیات ابن تیمیہ، از مولانا محمد حنیف ندوی، ص ۳۴۲، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور)

[۳] "اس تحریک کا بنیادی اصول یہ ہے کہ حق اور یقین کی دریافت کے لیے حواس، عقل، علم، قیاس، استقرار، برہان واستدلال قطعاً مفید نہیں، حصول صداقت کے لیے مشاہدہ شرط ہے اور یہ مشاہدہ صرف نور باطن اور اندرونی حاسہ کو بیدار کرنے سے ممکن ہے (باقی صفحہ ۱۸ پر)

"مسئلہ وحدت الوجود میں شیخ اکبر (ابن عربی) اور شیخ مجدد (حضرت مجدد الف ثانی) کا جو اختلاف ہے، وہ سب کو معلوم ہے اور دونوں بزرگوں کی تحقیق ذاتی علم اور کشف پر مبنی ہے۔" [1]

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں: "درحقیقت جیسا کہ حضرت مجدد نے لکھا ہے انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی، کوئی قوت اس کے حواس اور خارجی مؤثرات کے اثر سے بالکلیہ آزاد نہیں۔ اس کے ماحول، اس کے افکار و عقائد اور ان مقدمات کا جو اس کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلّم ہیں، اس کی تحقیقات اور مشاہدات پر ضرور اثر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ اشراقیوں کو اپنے کشف و مشاہدے میں بہت سے یونانی اور مصری اوہام و خیالات کی تائید نظر آتی تھی اور مسلمان اشراقیوں کو فلسفہ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت بن کر نظر آئے تھے۔ وہ "عقول" [2] کا مشاہدہ کرتے تھے اور عقل اول سے

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۷) جو ماورائے طبیعیات کا اس طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں۔ اور یہ حالت اسی وقت بیدار ہو سکتا ہے جب مادیت کو بالکل فنا اور حواس ظاہری کو مردہ کر دیا جائے۔ حقائق کی تحصیل (اس طرح) نفس کشی اور مراقبہ و تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔" (ملخص از مذہب و تمدن، از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۵ لکھنؤ ۱۹۸۰ء)

[1] مذہب و تمدن، ص ۳۳، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۸۰ء

[2] عقول عشرہ جو یونانی فلسفے میں واجب الوجود ہستی ہی کی طرح قدیم اور مستقل بالذات ہستیاں تسلیم کی جاتی ہیں، جنھوں نے افلاک تسعہ کو جنم دیا۔ گویا کہ یہ ۱۹ "معززین" ہیں جو "کارکنانِ قضا و قدر" کہلاتے ہیں۔

بعض اوقات ان کا مکالمہ اور مصافحہ ہوتا تھا۔[1]

کشف و مشاہدہ اگرچہ شرعاً ناجائز یا ممنوع نہیں ہے بشرطیکہ وہ کتاب و سنت کے مغائر نہ ہو اور شرعی حدود کے اندر اور نصوص دین کی تشریح و تفسیر میں ضمنی حیثیت رکھتا ہو، مگر چونکہ بعض صوفیہ نے غلو اور تجاوز سے کام لیتے ہوئے اس کو اولیت دے دی اور قرآن و حدیث کو ثانوی درجہ دیتے ہوئے ان کے نصوص میں طرح طرح کی تاویلیں شروع کر دیں تو علامہ ابن تیمیہؒ نے ان پر تنقید کرتے ہوئے بہت صحیح اصول بیان فرمایا ہے۔

۲۔ محدّث کو اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام و تحدیث کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ ان چیزوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لے اس لیے کہ صوفی کبھی مقام عصمت پر فائز نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ابوالحسن شاذلی نے تصریح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کی عصمت کا ذمہ تو لیا ہے، کشوف و الہامات کی عصمت کا نہیں۔[2]

انہی تمام وجوہات کی بنا پر امام ابن تیمیہ ابن عربی پر شدید جرح و تنقید کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ یہ فلسفہ زدہ لوگ اپنے اولیاء اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے فیض یاب ہوتے ہیں اور اس بنا پر وہ اپنے آپ کو نبی سے بھی افضل

---

[1] مذہب و تمدن، ص ۳۵۔ [2] محدّث وہ غیر نبی ہوتا ہے جس کے دل میں عالم بالا سے براہ راست کوئی بات ڈالی جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ تحریر فرماتے ہیں: "محدّث عالم ملکوت کے بعض علمی خزانوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور وہاں سے وہ علوم حاصل کرتا ہے جو حق تعالیٰ اس کو فراہم کرتا ہے، تاکہ وہ نبی صلعم کی شریعت بنے اور بنی آدم کی اصلاح کا باعث ہو ـــــ یہ بات شاہ صاحب نے خاص کر حضرت عمرؓ کے بارے میں تحریر فرمائی ہے جن کے الہامات وحی کے موافق ہوا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو، حجۃ اللہ البالغۃ، ۲/۹۳، رشیدیہ دہلی) [3] عقلیات ابن تیمیہ، از مولانا محمد حنیف صاحب ندوی، ص: ۳۵، لاہور۔

تصور کرتے ہیں[1]۔

اسی طرح موصوف اس سلسلے کے ایک دوسرے سرکردہ اور کٹر "وجودی" تلسمانی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: "جب ان کے سامنے "فصوص" پڑھی گئی تو ان سے کہا گیا کہ تمہاری یہ کتاب تو قرآن کے مخالف ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ قرآن تو پورے کا پورا شرک ہے اور توحید تو ہمارے کلام میں پائی جاتی ہے۔ پھر اُن سے کہا گیا کہ جب وجود واحد ہے تو پھر بیوی حلال اور بہن حرام کیوں ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک تو سب حلال ہے لیکن ان محجوبوں نے کہا کہ حرام ہے تو ہم نے کہا کہ ہاں تم پر حرام ہے۔"[2]

قرآن حکیم منصوص اور محکم طور پر بیان کرتا ہے کہ اس عالم ناسوت میں کسی بشر کے لیے ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ سے یہ درخواست کی کہ "رَبِّ اَرِنِیْ" "اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کروا دیجیے"، تو جواب میں ارشاد ہوا کہ "لَنْ تَرٰىنِیْ"، "آپ ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے"۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب یہ جواب ملتا ہے تو پھر اور کسی جن و بشر کی کیا مجال ہے۔"[3]

مگر اس کے باوجود جب حضرت موسیٰؑ نے رویت پر اصرار کیا اور باری تعالیٰ نے ایک پہاڑ پر اپنی تجلّی ظاہر فرمائی تو نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو دیکھ نہ سکے اور محض ظہور تجلّی ہی کے باعث بے ہوش ہو گئے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ج پس جب اس کے

---

[1] الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان، ص ۱۳، دارالافتاء، ریاض۔

[2] ایضاً ص ۱۲۲۔

[3] تفسیر معارف القرآن، از مفتی محمد شفیع، ۳/ ۴۱۱ دیوبند۔

رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی فرمائی تو اس کے پرخچے اڑ گئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ (اعراف ۱۴۳)

اس بنا پر "شہودیوں" کا نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ اس عالم ناسوت میں رویت باری تو کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ ہاں البتہ "رب اپنے بندۂ مومن کے لیے دنیا میں (اس کی رہنمائی کے لیے) غیر کامل (ایک ہلکے درجے کی) تجلی (ذاتی نہیں بلکہ صفاتی) فرماتا ہے اور آخرت میں کامل تجلی فرمائے گا۔ پس اس تجلی کے باعث بندہ اپنے رب کے ماسویٰ خود کو اور ہر چیز کو فانی سمجھتا ہے (گویا کہ) اس ذات واحد کے سوا کسی دوسرے (کے جمال نیرانی) کا مشاہدہ ہی نہیں کر رہا ہے اور وہ اس کو محض اپنی آنکھ سے نہیں بلکہ اپنی پوری روح مدرکہ کے ذریعہ دیکھ رہا ہے"۔ [1]

چنانچہ علامہ ابن قیم رح "مدارج السالکین" میں تحریر فرماتے ہیں:

"ان کے نزدیک نور کشف ہی شہود کا مبدأ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ (صفات عالیہ) کے معانی کی تجلیات ہیں جو قلب پر ظاہر ہوتی ہیں اور اس کی تاریکی کو روشنی سے منور کر دیتی ہیں اور اس طرح کشف کا حجاب دور ہو جاتا ہے، جب تمہارا یہ حال ہو جائے تو پھر تم کسی غیر کی جانب توجہ نہ کر سکو گے اور تمہارے قدم ڈگمگا نہیں سکیں گے ...... اس کے نور ذات کی کوئی شے متحمل نہیں ہو سکتی [2] اگر اللہ تعالیٰ اپنے (اور مخلوق کے درمیان) حجاب کو دور کر دے تو پھر پورا عالم تہہ و بالا ہو جائے جس طرح کہ پہاڑ اس کی تجلی کے باعث ریزہ ریزہ ہو گیا۔

---

[1] تفسیر المنار، ۱۶۷/۹　[2] یعنی بندے پر جو تجلی ہو گی وہ اس کے صفاتی نور کی ہو گی نہ کہ اس کے ذاتی نور کی۔ کیونکہ اس کا نور صفاتی اس کے نور ذاتی سے نسبتاً ہلکا ہونے کی بنا پر انسان اس کا تحمل کرے گا، جب کہ وہ نور ذاتی کا تحمل کسی بھی طرح نہیں کر سکتا۔ خود سورج بطور ایک مثال ہمارے سامنے موجود ہے جو اس کی مخلوقات کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے مگر بایں ہمہ ہم اس کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتے تو پھر اس کے خالق و مالک کے نور اور اس کی تجلیات کی تاب کہاں سے لا سکتے ہیں؟

ایک حدیث میں مذکور ہے: "اللہ تعالیٰ سوتا نہیں ہے، اور سونا اس کے لائق نہیں ہے۔[۵۱] وہ (بندوں کی روزی سے متعلق) میزان کو کبھی جھکاتا ہے تو کبھی اٹھا دیتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں رات کا عمل دن سے پہلے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے (نور کے پردے میں رہتا ہے) اگر وہ اس پردے کو کھول دے تو اس کے چہرے کی شعاعیں ہر اس مخلوق کو جلا کر خاکستر کر دیں گی جہاں تک اس کی نگاہ جائے۔[۵۲]

اس حدیث کو نقل کر کے موصوف تحریر فرماتے ہیں: "پس اسلام بندے کے لیے نور ہے اور ایمان بھی بندے کے لیے نور ہے جو پہلے سے زیادہ قوی ہے۔ اور احسان (تزکیۂ نفس) بھی اس کے لیے نور ہے جو ان دونوں سے زیادہ قوی ہے۔ لہٰذا اسلام، ایمان اور احسان[۵۳] تینوں جب جمع

---

[۵۱] کیونکہ سونا وہ ہے جس کو اعضاء و جوارح کے باعث تھکاوٹ محسوس ہوتی ہو۔ پھر چونکہ وہ پوری کائنات کا نگران و نگہبان ہے لہٰذا اگر وہ سو جائے تو پھر پوری کائنات منتشر و پراگندہ ہو جائے اور تمام اجرام سماوی باہم ٹکرا کر فنا ہو جائیں۔ (لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ: اس کو نہ تو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند ــــ بقرہ: ۲۵۵)

[۵۲] صحیح مسلم، کتاب الایمان، ۱/۱۶۲، مرتبہ محمد فؤاد عبدالباقی، دارالافتاء ریاض، ۱۹۸۰ء

[۵۳] یہ دین اسلام کے تین مختلف مدارج اور اس کے شعبے ہیں۔ اسلام محض احکام کی بجا آوری کا نام ہے خواہ عقیدہ و ایمان کمزور ہے یا قوی۔ ایمان شک کے مقابل ہے یعنی جن جن باتوں کو عقیدے کے لحاظ سے ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے ان پر پوری طرح یقین کرنے کا نام ایمان ہے اور احسان یہ ہے کہ وہ ایمان کی طرح محض عقلی و استدلالی نہ رہے بلکہ وجدانی و مشاہداتی بن جائے۔ جیسا کہ حدیث جبرئیل میں آیا ہے: ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراك" (تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا تصور ضرور کر لو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے) اس لحاظ سے احسان عبودیت کا اعلیٰ مرتبہ اور بندۂ مومن کی معراج ہے جو اصل مقصود ہے اور یہ مرتبہ انبیائے کرام کے بعد (باقی صفحہ ۲۳ پر)

ہوجائیں اور اللہ کے درمیان رکاوٹ بننے والے حجابات زائل ہوجائیں تو قلب وجوارح اس نور سے بھر جاتے ہیں (نہ کہ اُس نور سے جو اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے) کیونکہ اس کی صفات مخلوقات کی کسی بھی چیز میں حلول نہیں کرتیں، جس طرح کہ خود مخلوقات اس میں حلول نہیں کرتے۔ لہٰذا خالق مخلوق سے اپنی ذات وصفات کے لحاظ سے بالکل جدا ہے۔ نہ تو ان دونوں میں کوئی (مادی وجسمانی حیثیت سے) اتحاد ہے، نہ حلول ہے اور نہ کسی قسم کا ملاپ۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک کلہ علواً کبیراً [۵]

حاصل یہ ہے کہ اس عالم رنگ وبو میں رویت باریٔ تعالیٰ کا مشاہدہ قرآن حکیم کی واضح نصوص کی بنا پر ممکن نہیں ہے۔ اور یہ حقائق قرآن کے محکمات میں سے ہیں۔ ان کا انکار نصوص قرآنیہ اور محکمات کا انکار ہوگا، جس کے بعد حجت واستدلال کے لیے مزید کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی۔ اور جیسا کہ یہ بھی اچھی طرح واضح ہوگیا کہ رویت ومشاہدہ جو کچھ بھی ہوگا وہ صرف باریٔ تعالیٰ کی صفات یا اس کے کمالات کا ہوگا، جن کی تجلیوں سے صفات فطرت اور اس کے اوراق روشن وتابناک نظر آرہے ہیں۔ گویا کہ ایک ایک پتے اور ایک ایک بوٹے پر خلاقِ فطرت کی صنعت وکاریگری کے نقوش ثبت ہیں۔ اور یہ نقوش حسب ذیل عظیم آیات قرآنی کے مطابق "نظام تخلیق، نظام تسویہ، نظام تقدیر اور نظام ہدایت" کی شکل میں مرتسم ہیں جن کے مجموعے کو "نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۙ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۙ

پاکی بیان کر اپنے رب برتر کی جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا پھر (ان میں سے ہر ایک کے اعضاے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں ہی کو حاصل ہوتا ہے جو اس کے مقرب اور صدیقین و صالحین کہلاتے ہیں۔ یہ اسلامی تصوف کی صحیح غرض وغایت ہے، جس کو قرآن وحدیث کی اصطلاح میں "احسان" کہا جاتا ہے۔

[۵] مدارج السالکین، شرح منازل السائرین، بحوالہ تفسیر المنار، ۹/۱۶۹—۱۷۰۔

جسمانی کو) درست کیا۔ اور وہ جس نے (تمام موجوداتِ عالم کے طبیعی ضوابط) مقرر کیے اور (ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے ضابطے کے مطابق چلنے کی) توفیق بخشی۔ (اعلیٰ: ۱-۳)

سائنسی علوم کے ذریعہ جن نظاہائے فطرت کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہ درحقیقت ربوبیت کے انہی چار بنیادی ضوابط (تخلیق وتسویہ اور تقدیر وہدایت) کی تشریح وتوجیہہ ہے[1] مظاہر کائنات کو قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے گویا یہ چار پیمانے ہیں جن کے تفصیلی جائزے سے تمام صفات الٰہی کی تنقیح اس طرح ہوجاتی ہے گویا کہ وہ ہمارے سامنے مجسّم ومشکّل طور پر موجود ہیں اور قرآن عظیم نوع انسانی سے اسی چیز کے مطالعے ومشاہدے کا مطالبہ کرتا ہے جو کہ گوہر مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات اور کل موجودات کا خالق، مسوّی، مقدّر اور ہادی ہے، نہ کہ خود ان موجودات کے اندر گھسا ہوا یا مختلف شکلوں اور رنگوں میں ظہور پانے والا۔ وہ ان اشیاء اور موجودات سے بالکل الگ تھلگ ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی سیکڑوں بلکہ بے شمار آیتوں سے واضح ہوتا ہے۔ نیز اس کے مانند کوئی شے نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ: اُس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شے اس جیسی اور اس کے مثل ہے ہی نہیں تو پھر موجودات عالم ہی کو خدا کا وجود قرار دینا بے دلیل وبے سند اور عقلاً سخت محال ہے۔ خالق ہمیشہ خالق رہے گا اور مخلوق ہمیشہ مخلوق۔ اور یہ بات عقلاً ناممکن ہے کہ ایک شے خود ہی اپنی خالق، خود ہی اپنی مسوّی، خود ہی اپنی مقدّر اور خود ہی اپنی ہادی آپ ہو، جب کہ قرآن حکیم میں اس پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اشارہ تک موجود نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم کی تمام آیات خالق ومخلوق کی وحدت کے بجائے ان کی دوئی اور ثنویت پر دلالت کر رہی ہیں۔ تفصیل کے لیے تو ایک دفتر چاہیے۔ لہٰذا اس موقع پر اتنی ہی وضاحت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ (باقی آئندہ)

---

[1] اس موقع پر تفصیل نیز ان آیات کریمہ کی مفصل تشریح وتفسیر کے لیے راقم سطور کا مقالہ "قرآن مجید اور حیاتیات" دیکھنا چاہیے، جو ماہنامہ البلاغ کراچی میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔